© rasailojaraid.com

نقد و نظر

مظفر حسین

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم سے میری پہلی بار ملاقات ۱۶ دسمبر ۱۹۶۶ء کو ہوئی اور آخری ۲۶ نومبر ۱۹۶۹ء کو جو لاہور میں ان کا آخری دن تھا۔ چار سال کی یہ مختصر سی مدت ان کی بے لوث محبت کے دل پر ایسے نقوش چھوڑ گئی جو میرا بہترین اندوختۂ حیات ہیں۔ اس عرصے میں شاید ہی کوئی ایسا دن گزرا ہوگا کہ لاہور میں ہوتے ہوئے وہ مجھ سے نہ ملے ہوں۔ اس پوری مدت میں وہ طُورِ معنی کی ایک تجلّی بن کر میرے ذہنی اُفق پر چمکتے رہے۔ گھنٹوں کی گفتگو ہمارا روز کا معمول تھا اور گفتگو کا پھیلاؤ اسلام، اقبال، سائنس، مذہب اور حالاتِ حاضرہ کو محیط۔ مرحوم اپنے مخصوص انداز میں خرد کی گتھیاں سلجھاتے اور ان کی خرد افروز باتوں میں ذوقِ جنوں کی نہایت ہی خوشگوار لاگ ہوتی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے شرابِ جنّت میں زنجبیل کی نہایت لطیف آمیزش کردی گئی ہو۔ اسی طرح جب وہ مذہب جو ان کے نزدیک عشق و مستی سے عبارت تھا، گفتگو فرماتے تو یوں لگتا گویا شرابِ جنّت میں کافور کی چاشنی ملادی گئی ہو۔ عشق اور عقل کا نہایت ہی حسین امتزاج ان کی شخصیت کا بنیادی وصف تھا۔ حصولِ تعلیم کا انداز بھی کچھ ایسا ہی رہا۔ ایف۔ ایس۔ سی (نان میڈیکل) کی، پھر بی۔ اے، فارسی میں آنرز اور ایم۔ اے عربی میں کیا اور ان کی خداداد ذہانت نے عجم کا حسنِ طبیعت اور عرب کا سوزِ دروں، دونوں کو سمیٹا۔ پوری تعلیمی زندگی میں ایک دن کے لئے بھی فلسفہ کا درس نہیں لیا۔ لیکن ڈاکٹریٹ کی دونوں ڈگریاں (پی ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لٹ) انہیں فلسفہ میں پیش کی گئیں اور جو کتابیں یونیورسٹی کے نزدیک فلسفہ میں ان کے لئے سب سے بڑے اعزاز کی مستحق قرار پائیں وہ ان کی اپنی نیّت کے مطابق محض اسلام کی تبلیغ کا ایک ذریعہ تھیں۔

"آئیڈیالوجی آف دی فیوچر" آپ نے ایک شدید باطنی تقاضے سے مجبور ہو کر لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے جہالتِ حاضرہ کے اُن بتوں کو توڑا جو عصرِ حاضر کے کعبۂ علم میں لات و منات، مرودخ و یعوق، نسر و فسر اور عسر و غسر سے کم نہیں ہیں۔ اس کتاب کی شانِ نزول کے بارے انہوں نے ایک نہایت ہی عجیب و غریب واقعہ بیان فرمایا تھا جس کی تفاصیل تو اب ذہن میں محفوظ نہیں رہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ کتاب لکھنے سے پہلے خیالات کا ایک تند و تیز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طوفان ان کے ذہن میں سمٹ آیا تھا جس کے نتیجہ میں ڈاکٹر صاحب شدید علیل ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے اعصابی بے چینی تشخیص کی۔ انہی دنوں ان کے ایک عزیز ان کی بیماری کا حال سن کر ان کے پاس جموں تشریف لائے اور ایک دن سیر کے لئے ساتھ لے گئے۔ راستے میں پہاڑی کے ایک خوش منظر گوشہ میں ایک نہایت ہی نورانی شکل کے ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی جو انہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ایک بے اختیار کشش کے ساتھ ڈاکٹر صاحب ان کی طرف بڑھے تو انہوں نے علیک سلیک کے بعد انہیں مشورہ دیا کہ اپنی کتاب لکھنا شروع کر دیں۔ ان بزرگ کے مشورہ سے ڈاکٹر صاحب نے قلبی سکینت محسوس کی۔ گھر آکر قلم اٹھایا تو آمد کا یہ عالم تھا کہ رہوار قلم روکے نہیں رکتا تھا چنانچہ جس شخص نے بھی ان کی اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اُمید ہے کہ وہ اس میں آپ کی تحریر کی بے ساختگی اور بے پناہ روانی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کے اپنے بیان کے مطابق پوری کتاب دو تین ہفتوں میں مکمل ہو گئی۔ کتاب مکمل ہوتے ہی ڈاکٹر صاحب نے اپنے آپ کو یکبار محسوس کیا اور بیماری بھی جاتی رہی۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنی کتاب کا ایک ٹائپ شدہ نسخہ مرے کالج سیالکوٹ کے پروفیسر تلی کو پیش کیا جس پر انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ اسے کسی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے طور پر پیش کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مشورہ پر عمل کرتے ہوئے اسے پنجاب یونیورسٹی میں پی ایچ۔ ڈی کے لئے پیش کیا۔ پروفیسر تلی، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن ممتحن مقرر ہوئے۔ پروفیسر تلی نے مقالہ پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا کہ اس میں میکڈوگل کے نظریات کا حتمی ابطال موجود ہے۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے یہ رائے دی کہ "آج تک فلسفہ کی کوئی کتاب میری نظر سے ایسی نہیں گزری جو اسلام کے اس قدر قریب ہو جیسا کہ یہ مقالہ ہے۔" اور ڈاکٹر رادھا کرشنن اپنی ہندو عصبیت کے باوجود یہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا کہ "یہ مقالہ علم کی دنیا میں ایک ٹھوس اضافہ ہے۔"

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی تحریری صلاحیتیں تمام تر اسلام کی تائید اور حمایت اور باطل کی تردید اور ابطال کے لئے وقف تھیں۔ علامہ اقبال کا ان سے بڑھ کر شیدائی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ فکر اقبال ان کے رگ و ریشے میں سما گیا تھا۔ سوز و ساز رومی اور پیچ و تاب رازی کی کش مکش میں وہ اپنی راتیں گزارتے تھے۔ حبیب اللہ قریشی صاحب کو کئی بار ان کے ہاں ٹھہرنے اور رات گزارنے کا اتفاق ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے انہیں پوری پوری رات آنکھوں میں کاٹتے دیکھا ہے لیکن دن کو وہ چاق و چوبند اور پوری طرح مستعد اس طرح گھومتے پھرتے نظر آتے کہ کوئی شخص یہ گمان بھی نہ کر سکتا تھا کہ سوٹ بوٹ میں ملبوس یہ شخص اپنی راتیں کس اضطراب میں بسر کرتا ہے۔ علامہ اقبال کے شاعرانہ کلام اور فلسفیانہ نظریات کو سمجھنے کے لئے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی کتابوں سے بڑھ کر میں نے کسی اور چیز کو مفید نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پایا۔ علامہ اقبال کے خیالات کو اپنی تحریروں میں جس خوبصورتی کے ساتھ سمویا ہے اور ایک منظم نظام حکمت کی حیثیت سے اس کا احاطہ کیا ہے اس میں ان کا کوئی مثیل نہیں۔ اقبال کے شعری اور معنوی محاسن کے بیان کے لئے جس صاف اور شُستہ تحریر کی ضرورت تھی وہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے فراہم کی۔ مجھے ان کا یہ جملہ بہت یاد آتا ہے جو وہ اکثر فرمایا کرتے تھے، "اب تو آپ علامہ اقبال کو روتے ہیں لیکن آپ کو رفیع الدین بھی نہیں ملے گا۔" عبدالماجد دریا آبادی نے صدق جدید میں بہت صحیح لکھا تھا کہ "پاکستان میں علامہ اقبال کے بعد ڈاکٹر رفیع الدین ہی سب سے بڑے فلسفی ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب صحیح معنوں میں ایک درویش تھے۔ طبیعت میں بڑا سوز و گداز تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت تھی۔ اپنی کتاب "حکمتِ اقبال" کے انتساب کے بارے مجھ سے مشورہ فرمایا۔ میں نے رائے دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک نام سے منسوب کریں۔ معاً ان کے چہرے پر زردی اور سُرخی کی دو پرچھائیں نمودار ہوئیں۔ جن میں میری اس بے ادبی پر ان کی فکرمندی اور غصہ کا رنگ صاف جھلک رہا تھا۔ اپنے فہم و خیال کے مطابق میں نے اپنی طرف سے بہترین مشورہ دیا تھا لیکن جس انداز میں آپ نے مجھے ڈانٹ پلائی اس سے اپنی کم علمی اور ذہنی ناپختگی مجھ پر بخوبی واضح ہوگئی۔

ع

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

ایک روز مجھ سے حضرت ابوذرؓ کا ذکر فرما رہے تھے کہ ان کی موت کا ذکر آ گیا۔ فرمانے لگے کہ موت کے وقت ان کی کل جائیداد مٹی کا ایک گھڑا اور لکڑی کا ایک پیالہ تھی جس کی طرف آپ کی نگاہ بیقرار بار بار فکرمندی میں لوٹتی اور بڑی پریشانی میں فرماتے۔ "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر یہ پوچھ لیا کہ میرے بعد تم دنیا میں مصروف ہوگئے تو میرے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔" بڑی مشکل سے یہ واقعہ بیان کر پائے۔ آواز بار بار گلے میں رُندھ جاتی تھی، آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔

ڈاکٹر صاحب ہمارے ہاں تشریف لاتے تو اباجان مرحوم سے بھی کبھی کبھی آمنا سامنا ہو جاتا۔ بات فقط علیک سلیک اور مزاج پرسی تک محدود رہتی لیکن اباجان مرحوم ہمیشہ مجھے فرماتے تمہارے یہ دوست مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ بہت نیک اور صاحب دل ہیں اور تمہیں ان کے پاس بیٹھے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کے دل میں بھی والد مرحوم کی بے پناہ عزت تھی یہاں تک کہ مجھے فرمایا کرتے کہ تم ان سے بیعت کر لو۔ میرے والد مرحوم حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوریؒ سے بیعت تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا اصرار بڑھتا تو میں ان سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہاکہ انہیں تو اجازت نہیں ملی۔ فرماتے کوئی بات نہیں ان سے ذکر کا طریقہ ہی سیکھ لو۔ ڈاکٹر صاحب خود مفتی محمد حسن صاحبؒ سے بیعت تھے لیکن فرمایا کرتے تھے کہ تصوف میں نے ورثے میں پایا ہے۔ میرے جدامجد مولوی غلام رسولؒ اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ تہجد اور ذکر کثیر کی ہمیشہ تاکید فرماتے کیونکہ خود بھی ان کے لذت شناس تھے فرمایا کرتے تھے کہ ایک وقت مجھ پر ایسا گزرا کہ مجھے ذکر کی لذت میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا اندیشہ لاحق ہوگیا تھا کیونکہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ایک بار سبحان اللہ کہا تو اس کا سرور جان لیوا ثابت ہوگا۔

عبد اور معبود کا رشتہ ان کے نزدیک محبت اور حسن کا تعلق تھا۔ مجھے ان کے بیان کا وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتا جب وہ نہایت ہی جوش وخروش کے ساتھ فرما رہے تھے کہ "اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر دیا ہے اور اس کی فطرت میں اپنی محبت کا جذبہ نہیں رکھا تو اس نے آخر کیا کیا ہے؟"

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی
ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بیباک

فرمایا کرتے تھے کہ ذکر کی برکت سے بہت اچھے اچھے خیالات خود بخود سوجھتے ہیں اور معمولی سی کوشش سے علمی حقائق منکشف ہو جاتے ہیں اور انسان کے لئے تھوڑا سا مطالعہ بھی کفایت کر جاتا ہے۔ ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ دین کا منتہا و مقصود عقلی اطمینان پر اکتفا کرنا نہیں بلکہ ایک جذبہ بیدار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ایسا تعلق استوار کرنا ہے کہ دنیا کا رشتہ و پیوند اس کے مقابلے میں حقیر نظر آنے لگے۔ اپنے چار سالہ تعلقات کے دوران میں نے خود ان کی اپنی زبان سے دینوی علائق کے بارے میں بہت کم سنا۔ بلکہ مجھے ان کی زندگی میں یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ ان کے کل کتنے بچے ہیں، سوائے شجاع الدین سلمہ کے جو انجینئرنگ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے یا ایک آدھ بار اپنی بچیوں کا ذکر فرمایا۔ لڑکوں کے مستقبل کے بارے میں نے کبھی انہیں فکرمند نہیں پایا۔ ایک دن کہنے لگے اگر پیسہ ہی کمانا مقصود ہو تو میں کوئی سا بھی کاروبار کر کے ایک معقول آمدنی حاصل کر سکتا تھا لیکن اللہ کا مجھ پر بڑا فضل ہے کہ میں نے ہمیشہ دین کے لئے ہی کام کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی روزی کے بارے میں مجھے فکرمند ہونے کی کبھی نوبت ہی نہیں آنے دی۔

ایک بار میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک ذات خداوندی کی بنیادی صفت حسن ہے کیا اس کی تصدیق قرآن سے بھی ہوتی ہے؟ ویسے اللہ تعالےٰ کے معروف ننانوے صفاتی اسماء میں تو جمیل یا حسین کے اسماء نہیں پائے جاتے۔ "اللہ جمیل ویحب الجمال" ایک حدیث کے الفاظ بیان کئے جاتے ہیں لیکن معلوم نہیں اس

باقی صفحہ ۴۲ پر

© rasailojaraid.com